محمد احمد حامی

پاکستانیت کی اساس

فی زمانہ ہر شہری کو اپنے ذاتی معاملات سے الگ ہوکر اجتماعی سطح پر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ دوسرے شہریوں کے ساتھ کس بنیاد پر اپنے تعلقات استوار کرے۔ جس سے ایک متحد اور مربوط معاشرہ جنم لے سکے اور جس میں نہاں مقصدیت اس قدر معقول اور راسخ ہو کہ اس کے لیے قربانی کرتے وقت ایک فخر اور طمانیت کا احساس ہو۔ یوں تو اس کرۂ ارض کے تمام انسان ایک ہی نوع کے افراد ہونے کے رشتہ سے انسانی برادری کی ارفع اقدار کے پابند ہونا چاہیں اور کسی اور تقسیم پر مبنی نظام کو اس مقدس رشتہ سے نہیں ٹکرانا چاہیے مگر حقیقت یہ ہے کہ تنازع للبقاء کے حیوانی کلیہ سے انسان بطور فرد تو مستثنے ہو گیا مگر بقائے اصلح کے سلسلہ میں گروہوں، برادریوں، قوموں، ہم عقیدہ اور جغرافیائی اکائیوں کی صورت میں اب بھی بٹا ہوا ہے۔ مزید وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ اگر عالمگیر انسانی برادری کو ہی اکائی فرض کر لیا جائے تو بعض اقوام یا بعض ملکوں یا بعض ہم عقیدہ افراد کو بود و باش اور رہن سہن کی سطح پر اتنی قربانیاں کرنی پڑیں گی جن سے کم ترقی یافتہ گروہ بھی ترقی کر کے ان کے برابر ہو سکیں۔ مگر اول الذکر کبھی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ان کے لاشعور میں بقائے اصلح کارفرما ہے اور وہ کہتے تو نہیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ جو اہل نہیں انھیں زندہ رہنے کا حق نہیں۔ انھیں مٹ جانا چاہیے ایسے ترقی یافتہ گروہوں کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ انھوں نے کشمکش حیات میں اجتماعی سطح پر کوشش کی تھی اس لیے اس جد و جہد میں کامیابی کے ثمرات سے متمتع ہونے کا حق بھی صرف اسی گروہ کو ہے۔ باقی لوگ جو کار زار حیات میں آسائش پرستی میں مصروف رہے یا ان کی سعی غلط راستوں پر جا نکلنے کی وجہ سے نا مشکور ہوئی، انھیں کامیاب جماعت کے ساتھ کیوں شریک کیا جائے۔

اسی ذہنیت نے گروہ بندی کے لیے مختلف وقتوں میں الگ الگ مقاصد کو چنا اور ان کی بنیاد پر معاشرہ کی تعمیر کی، حکومت کے لیے قوانین بنائے، انفرادی حقوق کی تعیین کی اور بین الاقوامی یا بین المملکتی تعلقات کے لیے اقدار قائم کیں۔ اگر مطالعہ کی خاطر ایسے گروہ کے لیے لفظ قوم استعمال کیا جائے تو بعض اقوام نسل کے رشتہ سے یک جہتی کی مدعی بنیں، بعض نے جغرافیائی حدود کو اپنی حدیں قرار دے لیا۔ کچھ نے ہم عقیدگی کو اپنی اساس بنا لیا اور کچھ من چلے ماضی قریب میں ایسے بھی نکلے جنھوں نے معاشی نظریات کی ہم آہنگی کو اپنے اتحاد کی بنیاد چنا۔

یہاں پر ہر نظریہ کے مالۂ و ماعلیہ کا جائزہ مطلوب نہیں، اور نہ ہی ان اقوام کی نشاندہی ضروری ہے جنھوں نے اپنے مذاہب یا ممالک یا نسب وغیرہ کی نسبت سے دوسروں پر برتری کا دعویٰ کیا کہ یہ سب اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اور یہ تحریر ان تفاصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ فقط ایک مختصر سوال کا حل مقصود ہے کہ پاکستان میں بسنے والے کس نظریہ کو لے کر اٹھے تھے، کس دعویٰ سے انھوں نے الگ خطۂ زمین نشان زد کرایا، کس نظامِ حیات پر چلنے کے خواہش مند ہیں اور اگر کبھی تمام پاکستانیوں کو متحد ہونا پڑے تو کس اساس پر ہر پاکستانی جمع ہو سکے گا اور کس نعرہ پر اپنی جان، مال اور آبرو کی بازی لگا سکے گا۔ مفصلہ بالا مختصر مگر ادق تعارف کے بعد اس مسئلہ پر بحث تفصیل اور سلاست کی مقتضی ہے تاکہ ہر پاکستانی اپنی جگہ اس اہم عنوان پر سوچ سکے، دوسروں کو ہم رائے بنا سکے تاکہ اصول پر یکے بعد دیگرے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے کسی ایک اصل پر متحد ہو جائیں۔ سو یارانِ نکتہ داں کو دعوتِ عام دیتے ہوئے اس موضوع کو تجزیہ کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

یہ سوال سنتے ہی ایک مسلمان پاکستانی ایک لحظہ ٹھٹکے بغیر فوراً یہ جواب دے گا کہ پاکستان مذہب اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ یعنی برِّ صغیر ہند کے مسلمانوں نے یہ خطہ اس لیے حاصل کیا تھا کہ یہاں پر اسلام کے نظامِ حیات کے نفاذ میں پوری آزادی میسّر ہو۔ قوانین اسلام کے احکام کے دائرہ میں بنائے جائیں۔ عوام الناس اسلامی زندگی اختیار کریں اور اپنے ہر قول اور فعل میں اسلام کی تعلیم کو راہ نما بنائیں۔ پاکستانی غیر مسلموں سے اسلامی قوانین کے تحت سلوک کیا جائے۔ اور

بین الاقوامی تعلقات میں اسلامی رشتے اولیت کے مقام پر رکھے جائیں، وغیرہ۔ اور بادی النظر میں یہ جواب بہت معقول ہے۔ لیکن پاکستان آج سے سترہ برس پیشتر منصۂ شہود پر آیا تھا اور اس کے معاملات کی باگ ڈور پاکستانی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ سترہ برس کا عرصہ کسی نظریاتی نظام کے تجربہ کے لیے بآسانی کفایت کرتا ہے۔ سو اس امر پر بحث کہ کیا اسلام، یا اس مقصد کے لیے کسی بھی مذہب کی بناء پر جغرافیائی ممالک کا نظام استوار کرنا ممکن بھی ہے یا نہیں، چھوڑتے ہوئے صرف اس طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ اگر واقعی ہم نے اسلام کی تعلیم کے نفاذ اور اسلام کے قوانین کی مشق کے لیے بے اندازہ نقصانات اٹھا کر یہ خطۂ زمین حاصل کیا تھا تو ہم ان سترہ برس کے عرصہ میں اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اور اگر ماضی کے اس عرصے کے ہمارے انفرادی اجتماعی، مملکتی اور بین المملکتی کردار کو دیکھا جائے تو کیا یہ کسی جہت سے کسی حد تک بھی ہمارے منتخب کردہ پیمانوں پر پورا اترتا ہے۔

ہمارے ادعا کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ پاکستان میں جو قوانین بھی پاکستانیوں پر حکومت کرنے کے بنائے جائیں وہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں مرتب ہوں گے۔ اس بات سے قطع نظر کہ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں پر اسلامی قوانین ازراہِ جبر نافذ کرنا کیونکر معقول اور جائز ہو گا، کہ اس سوال پر تفصیلی بحث بعد میں کی جائے گی، سوال یہ ہے کہ ایسے قوانین کس اسلام کی روشنی میں بنیں گے۔ کہا گیا کہ اس کا مخرج قرآن ہو گا۔ اس پر مطالبہ ہوا کہ نہیں، سنتِ نبوی چونکہ قرآن کی رو سے ہی قرآن کی شارح ہے اس لیے قرآن اور سنّت سے استنباط کیا جائے اور امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن و سنت پر مبنی اصول تو الگ رہے نصوص کی تعبیر میں بھی مفتیوں اور آئینی ماہرین میں ابتداء سے ہی اختلاف رہا ہے اس کے پیشِ نظر اجماع کی گنجائش ابزاد کی گئی جو خود متنازع فیہ ہے۔ اگر کسی ایک تشریح پر کثرتِ رائے ثابت بھی کر دی جائے تو چونکہ یہ معاملہ نہ صرف دنیوی فلاح سے متعلق ہے بلکہ اخروی نجات کو متاثر کرتا ہے اس لیے مخالف رائے رکھنے والی اقلیت پر اس کثرتِ رائے کو مسلط کرنا ظلم ہو گا۔ پھر بعض مسائل جو زمانۂ گزشتہ میں امتِ مسلمہ کے سامنے نہیں آئے ان پر موجودہ حالات کے تحت اور نو دریافت علوم

کی روشنی میں اجتہاد کا مقام کیا ہوگا؟ جب پاکستانی مسلمانوں کے گروہ یا فرقے بنیادی نصوص کی تعبیر پر ہی متفق نہیں ہیں تو مستخرج قوانین پر اجماع امت کہاں سے دستیاب ہوگا۔ اور چند فقیہوں کا اجتہاد کروڑوں افراد کے لیے کس طرح واجب العمل قرار دیا جا سکے گا۔ اس حقیقتِ حال کے پیش نظر پاکستانی مسلمانوں کے باہمی روابط کس اساس پر استوار ہوں گے؟ جب باجماعت عبادت، جنازہ، ازدواج وغیرہ ابتدائی تعلقات میں ہی تفریق ملحوظ رکھی جاتی ہے اور بعض اوقات غیر معقول اور مضحکہ خیز جزئیات پر قتال اور فساد کی نوبت آجاتی ہے تو قوم ایک امام کے پیچھے، ایک سالارِ جیوش کے نیچے، ایک سیاسی راہ نما کے ساتھ کیونکر متحد ہوگی اور کبھی ایسا وقت آگیا کہ قوموں کی زندگی میں ایسے مراحل ضرور آیا کرتے ہیں تو اس خلفشار میں مبتلا بزعم خویش پاکستانی ملت کا کیا ہوگا؟

آئینی صورتِ حال سے الگ ہوتے ہوئے اگر معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں کو لیا جائے تو اب تک ہم نے کیا کیا ہے۔ قرآن نے تو لا تقربوا الزناء کا فرمان جاری کرکے ناجائز تعلقات زناشوئی کو یکسر خلافِ قانون قرار دے دیا تھا مگر ہمارے یہاں موجودہ قانونِ امتناعی کے نفاذ سے قبل حرام کاری کے لیے حکومت کے زیر انتظام اجازت نامے جاری ہوتے رہے[۵] جن کی فیس خزانہ حکومت میں ملی بہبود کی خاطر داخل ہوتی ہے۔ سود اور شراب کو اور جوئے کو بغیر کوئی الجھاؤ رکھے منع کیا گیا۔ ہم کیوں ان کو اپنی مملکت میں ناجائز قرار نہیں دے سکے۔ کیا یہ ناممکن ہے۔ کیا ہم میں ان قوانین کے نفاذ کی خواہش نہیں۔ کیا ان پر پابندی سے ناقابل تلافی نقصان ہوگا جس سے پاکستان کی بقاء خطرے میں پڑ جائے گی؟ مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں مگر چونکہ ذکر اصول کا ہے اس لیے انہی پر اکتفا کرتے ہوئے ایک پاکستانی صورت سوال ہے۔

بین الاقوامی سطح پر ہم نے کیا معیار اپنایا۔ کیا تمام مسلمان اکثریت والے ممالک ہمارے دوست

---

[۵] یہ تحریر اس وقت لکھی گئی تھی جب موجودہ قانون امتناعی نافذ نہیں ہوا تھا۔ بحث کی افادیت کی خاطر اسے مضمون سے خارج نہیں کیا گیا کیونکہ قیام پاکستان سے اب تک کا محاسبہ مقصود ہے۔ ۱۲

ہیں اور وہ جن کو دوست نہ بنانے کا حکم ہماری آسمانی دستاویز میں ہے ہمارے دشمنوں کی فہرست میں ہیں ؟ ایک چھوٹا سا مگر غورطلب سوال ارباب علم سے اور ہے۔ اگر پاکستانیوں کے نزدیک اوّلیت اسلام کے رشتے کو ہے تو اس صورت میں کہ خدانخواستہ کسی مرحلہ پر پاکستانی قوم کسی دوسرے ملک سے برسرِ پیکار ہوتی ہے اور میدانِ جنگ میں مخالف ملک اپنے مسلمان باشندوں کی ایک جماعت مقابلہ پر لا کھڑی کرتا ہے تو کیا پاکستانی مسلمان کے ہتھیار مقابل پر آئے مسلمان پر اٹھ سکیں گے ؟ یہ مفروضہ بعید از امکان نہیں۔ ذرا سے فکر سے پاکستانی اپنے چاروں حدود پر ایسے امکانات کو متصور کر سکتے ہیں۔ پھر وہی سوال کہ ان حالات میں ہمارے سیاسی نظریات شکست تو نہیں کھائیں گے ؟

اب انہی پہلوؤں کو سامنے لا کر اپنی ستر سالہ زندگی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ہم کہاں سے چلے، کہاں آپہنچے اور اب کہاں کا رخ ہے۔ رُخ تو متحرک قوموں کا ہوتا ہے، ہم نے تو ابھی تک اپنی قومیت کی اساس ہی معین نہیں کی۔ کشاکشِ روزگار نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ یہ سوچا جائے کہ اگر الٰہی قانون کے تحت ہم پر آزمائش کا وقت آ گیا جب یہ روزگار کے دھندے تو کجا، محض زندگی ہی محلِ نظر ہو جاتی ہے تو ہم اپنا منہ کدھر پھیریں گے۔ کس کو راہ نما بنائیں گے، کس کے پیچھے ہو کر لڑیں گے۔ کیا نعرہ ہوگا، کون راستہ چنیں گے، کاہے کے لیے اپنا خون بہائیں گے۔

تو آیئے نئے سرے سے اپنی بنیاد کا جائزہ لیں کہ جس عمارت کی بنیاد ہی نہ ہوگی یا کمزور ہوگی اسے بادِ متحرک کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی سرنگوں کر جائے گا۔ کیا اسلام ہمارا مذہب ان تقاضوں پر پورا نہیں اترتا اور ہم کو اسلام کا نعرہ دینے والوں نے ہم سے دھوکا کیا۔ یا ہم نے ہی اسلام کو محض نعرہ سمجھا۔ قرآن کو صرف قسم کھانے کے لیے استعمال کیا اور سنّت کو فقط مسلمان کہلانے کے لیے اپنایا۔ یا اسلام بین الاقوامی انسانیت کا علمبردار ہے۔ شارع علیہ السلام کی تعلیمات ہمارے معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی تقاضوں کے لیے مکتفی ہیں۔ کیا قرآن اور ارشاداتِ حاملِ قرآن پر عمل کرنے سے ہم مہذب دنیا کے مقابلہ میں ناکام اور شرمندہ ہوں گے یا ان کی خلوصِ دل سے بجا آوری ہمیں دنیا میں سربلند اور عقبیٰ میں سرخرو کرے گی ؟

سو اگر اب بھی ہم اس فیصلہ پر قائم ہیں کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوگا۔ ہماری طرف سے ہر کارروائی اسلام کے اصولوں کے تحت ہوگی اور ہمارے تمام تنازعات میں اسلام ہی حکم اور عدل بنے گا تو پھر دیر کیا ہے۔ کیوں نہیں اسلام کو فوراً اس کی صحیح جگہ دی جاتی۔ اسلامی لیبل سے سوا کیوں اندرونہ پر بھی اسلامیت کی مُہر نہیں لگائی جاتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا طریق کار ماضی میں غلط رہا ہو۔ ہم نے اپنے ملک، اپنے طرز حکومت، اور اپنے آئین کو تو اسلامی کہہ دیا مگر کیا وجہ کہ اس کے باوجود ہماری زندگی میں اسلام نفوذ نہ کرسکا۔

ایک بات بڑی واضح ہے کہ اگر ہمارے نظام حیات نے اسلامی تعلیمات کا انجذاب نہیں کیا تو نتائج بتاتے ہیں کہ یہ طریق کار ہی غلط تھا۔ سو کیوں نہ اب دوسری جہت سے کوشش کی جائے۔ مطلب یہ کہ پہلے سے مجتمع گروہ کو اسلام کی چھاپ لگانے کی جگہ اسلام کو رائج اور نافذ کرنے کی اکائی فرد کو قرار دیا جائے اور اگر افراد اپنی اپنی زندگیوں میں اسلام کو مقدم کرلیں تو ان افراد کے اجتماع سے جو گروہ بنے گا وہ بدرجۂ اولیٰ اسلامی ہوگا۔ اب وہ سوال کہ کونسا اسلام انفرادی زندگیوں پر حاوی ہوگا، یہاں حل ہوسکتا ہے کہ چونکہ اسلام کا حامل قرآن اور اسلام کا شارح رسولؐ تمام بنی نوع انسان کی طرف بھیجے گئے ہیں اس لیے ہر فرد مختار ہے کہ قرآن اور رسولؐ کو سامنے رکھ کر اپنے لیے لائحۂ عمل منتخب کرے۔ کسی زید کو یہ حق نہیں ہے کہ بکر کے ذاتی اجتہاد پر اعتراض کرے۔ کوئی بکر عمرو کے انفرادی اعمال پر معترض نہ ہوگا۔ اہل سنت، اہل تشیع، اہل حدیث، اہل قرآن اور ان کی شاخیں سب آزاد ہیں کہ قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ کی اپنی اپنی تعبیر کے مطابق اپنی اپنی زندگی میں تعمیل کریں۔ جب قرآنی ارشاد کے تحت تمام مسلمانوں نے توحید الٰہی، رسالت پیغمبرؐ اور وجوب قرآن کا اقرار کرلیا تو باقی کیا رہ گیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے تو فرمایا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلیا وہ جنت میں داخل ہوگیا۔ اور جس نے ہماری طرز پر عبادت کی، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کیا، ہمارا ذبیحہ کھالیا، اس کے ہم میں سے ہونے میں کیا دقیقہ باقی رہ گیا۔ ایک کلمہ گو جب اُسی رسولؐ پر درود بھیجتا ہے، اسی قبلہ کی طرف منہ کرکے، وہی قرآن تلاوت کرتا ہوا اللہ تعالےٰ کے حضور سر جھکا دے تو اس کے اسلام میں شک کرنے والے کو خود اپنی عاقبت

کی فکر ہونی چاہیے۔

اور کیا ہم اس کُلیہ کا تجربہ نہیں کر چکے۔ جس نے خود اپنی زبان سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا تھا، وہ معاً اس عجیب تحریک میں شامل کیا گیا تھا جس نے بالآخر پاکستان کو حقیقت بنا دیا تھا۔ شیعہ، آغا خانی بوہرے، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اہل قرآن، احمدی اور دوسرے فرقے کیا ایک ہی جھنڈے تلے جمع نہیں ہو چکے؟ ان سب کو اپنی اپنی سمجھ کے مطابق دیانتداری سے اسلام پر عمل پیرا ہونے کی اجازت ہے۔ لیکن جہاں اجتماعی زندگی میں کوئی مرحلہ پیش آئے گا یہ سب اوّل و آخر پاکستانی ہوں گے۔ ان کی انفرادی زندگیوں میں اسلام کے نفاذ اور رواج سے معاشرہ کی وہ تمام بدیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی جن کو قانون آج تک ختم نہیں کر سکا۔ ان میں سے کسی کا اسلام زنا، چوری، غیبت، رشوت، شراب نوشی، جوئے بازی، سود خوری اور دوسری معاشرتی برائیوں کی اجازت دیتا ہے؟ سو ضرورت اس امر کی ہے کہ افراد مسلمان بنیں، قوم خود بخود مسلمان ہو جائے گی۔

اجتماعی اور بین المملکتی مسائل کے لیے حل کی تلاش سے قبل پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے لیے ان کی انفرادی زندگیوں کے لائحۂ عمل کا ذکر ضروری ہے۔ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم شہری اپنے عقیدہ کے مطابق انفرادی زندگیاں گزاریں گے یا ان کے لیے بھی اسلام کا تجویز کردہ کوئی لائحۂ حیات پیش کر کے انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کے پابند ہوں۔ یہاں پر ہمیں اسلام کا طرۂ امتیاز لا اکراہ فی الدین کا روشن مینار راستہ دکھاتا ہے۔ اس فرمان کی دلیل بطور دیباچہ کے یہ دی کہ چونکہ رشد و ہدایت گمراہی سے ممیّز ہو چکی ہے۔ اور قرآن نے اس قدر دلائل اپنے اوامر و نواہی کے حق میں دے دیے ہیں کہ ہر دعویٰ روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ سو اب افراد پر کسی جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں۔ قرآن کا کام اتمام حجت تھا، اور اُس کے بعد انکار منکرین کو مُنزل قرآن کے سامنے تو مجرم بنا سکتا ہے، مسلمان اس کے لیے خدائی فوجدار نہیں ہیں۔ سو اس سنہری فرمان کی تعمیل میں پاکستانی غیر مسلم اسی طرح اپنے عقیدہ، عبادت، اور طرزِ زندگی میں خود مختار رہیں جس طرح مسلم شہری۔ مؤخر الذکر ان کے بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں میں کیوں مخل ہوں۔ البتہ جب بحیثیت پاکستانی

قوم کے ان کو قوم کی مدد اور فلاح کے لیے بلایا جائے گا اور مسلّمہ اجتماعی فرائض کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ آکھڑے ہوں گے۔ اور یہ پاکستانی قوم اور وہ مسلّمہ اجتماعی فرائض کیا ہیں جن پر یہ ساری پاکستانی قوم متفق و متحد ہو سکتی ہے؟ پاکستان ایک جغرافیائی خطّہ کا نام ہے۔ جس کی حدود کرۂ ارض پر مرقوم اور مرتسم ہیں۔ یہ سب پاکستانیوں کا گھر ہے۔ یہاں وہ پیدا ہوتے ہیں، اسی مٹی کی پیداوار پر پلتے ہیں اور اس کی بہبود کے لیے زندگیاں گزارتے ہیں۔ تو کیوں نہ اس مقدس رشتہ کو پاکستانی قوم کی یکجائی کے لیے اساس قرار دے دیا جائے۔ یہ ہرگز اسلام کے منافی نہیں ہے۔ اسلام کے رسولؐ نے تو فرمایا ہے کہ منجملہ اوروں کے جو اپنے گھر کی حفاظت کرتا مارا جائے وہ شہید ہے جو اپنی عزت و آبرو کو بچاتے ہوئے جان کھودے وہ شہید ہے تو ہمارے لیے پاکستان کے خطّہ سے بڑھ کر پیارا کون سا گھر ہے۔ پاکستان سے بڑھ کر کونسی دولت ہے پاکستان سے بڑھ کر کونسا فخر اور عزت ہے جس کی حفاظت اور بقا رکو اپنی زندگیوں کا مقصود بنالیں۔ سو پاکستان اوّل اور پاکستانِ آخر، یہ پاکستانی مسلم کو بھی عزیز ہے اور پاکستانی ہندو کو بھی پیارا ہے اور پاکستانی عیسائی بھی اس سے محبت کرتا ہے اور پاکستانی بہائی بھی اس کا شیدا ہے۔ اس نظریہ کو اپنا لینے سے ہماری اجتماعی سعی کا ایک مرکز قرار پا جائے گا۔ یہ اجتماع چاہے ایک کنبہ کی سطح پر ہو، چاہے گلی محلہ کی آبادی، چاہے ایک گاؤں کے باسیوں کا مجموعہ، چاہے ایک ذات برادری کے لوگ، چاہے ایک مذہبی عقیدہ کے پیرو اور چاہے سیاسی مقاصد کے لیے بنی ہوئی جماعتیں، جب سب کا مقصود مملکت پاکستان کی بقاء، پاکستان کا دفاع، پاکستان کی فلاح ہو جائے گا تو یہ یک جہتی ایسی ہو گی جس سے پاکستانی قوم کے راہ نما کے ایک اشارہ پر ساری قوم اٹھ کھڑی ہو گی اور دوسرے اشارے پر بیٹھ جائے گی۔ ایک آواز پہ آگے بڑھے گی اور دوسرے حکم پر لوٹ آئے گی اور یہی وہ سیسہ پلائی دیوار ہو گی جس میں کوئی درز اور کوئی رخنہ پیدا نہ ہو سکے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ لفظ اسلام کو محض نعرہ بازی کے لیے استعمال کرنے کی بجائے، اسلامی تعلیم اور اسلامی مزاج اور اسلامی اطوار کو سنجیدگی سے اپنی زندگیوں میں رواج دینے کی ضرورت ہے اور جب پاکستانی مسلمان افراد اپنی نجی حیثیت میں یا ہم خیال جماعتوں کی صورت میں سچے مسلمان بن جائیں گے

تو پاکستانی معاشرہ اور پاکستانی تہذیب اور پاکستانی تمدن خود بخود اسلام کا آئینہ ہو جائیں گے اور یہ وہ صورت ہے جس سے وہ عالمگیر برادری کو متاثر کر سکتے ہیں اور غیر مسلموں کو متوجہ کر سکتے ہیں۔ ملکی سطح پر پاکستان کو اپنا گھر سمجھتے ہوئے، سبھی پاکستانی، مسلم یا غیر مسلم اس سرزمین کی حدود کے اس تقدس کو اگر مثبت نظریاتی مقام دے دیں تو مستقبل میں کسی مسلمان ہمسایہ سے معاملہ کرتے وقت، یا بد اندیش حملہ آور سے دفاع کرتے ہوئے ان کے دلوں میں کسی قسم کا انقباض پیدا نہ ہو گا۔ اسی طرح دور بیٹھے حلیفوں یا حریفوں کو پاکستانی مفاد کی بنیاد پر کلی شرح صدر کے ساتھ ٹھکرایا یا اپنایا جا سکے گا۔ اغلب ہے کہ عملاً ہمارا ردِ عمل نئی صورتِ حال میں بعینہ وہی ہو جو موجودہ وقت میں ہو سکتا ہے مگر اس بار انداز فکر بدل جانے کی وجہ سے وہی منفی رویہ اب اثبات میں بدل جائے گا، اور انقباض و تامل اب انشراح اور آمادگی کی کیفیتیں اختیار کرے گا اور ہم پاکستانی اپنے سب معاملے روشن ضمیری سے طے کر لیں گے اور کوئی بھی محض اسلام کے جذباتی نعرہ پر پاکستانی قوم سے ناجائز انتفاع نہ کر سکے گا۔

اور آخر میں سب سے اہم بات کہ ہماری شخصی جدوسعی یا اجتماعی ترقی یا معاشرتی ارتقا ریا ہمارے ملک کی سرفرازی اصل مقصد نہیں ہیں بلکہ یہ سب اصل کے حصول کا ذریعہ ہیں اور اصل ہے انسانیت کا ارتفاع کہ ہمارا تو نصف دین ہی حقوق العباد پر مشتمل ہے اور اللہ کے بندوں میں رنگ، نسل، بولی اور جغرافیائی وابستگی کی کوئی تمیز اور تفریق نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارا ہر فعل انسانیت کے مفاد اور بہبود کی جہت میں ہونا چاہیے حق یہ ہے کہ جو کوئی انسان مجموعی علم اور تجربہ میں حقیر سا ایسا اضافہ بھی کر جاتا ہے جو بالآخر انسانیت کے میں ممد ہو وہ اپنی پیدائش کا جواز ثابت کر گیا اور نفسِ مطمئنہ کے ساتھ جیتے جی بہشت میں داخل ہو گیا اور جس نے اپنی حیات مستعار جانوروں کی طرح محض کھانے پینے اور نسل کشی کے جبلی تقاضوں کے ایفاء میں گزار دی اس کی پیدائش عبث، اس کی زندگی بے کار اور اس کی موت امتحان۔ فرمایا

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ۔